The Partition Riots in Manto's Migration Fiction: A Critical Study of the Social and Moral Crisis

منٹو کی مہجری افسانہ نگاری میں تقسیمِ ہند کے فسادات: سماجی و اخلاقی بحران کا تنقیدی مطالعہ

Muhammad Naeem Khan *[1]
Ph.D Scholar, Department of Urdu, The Imperial College of Business Studies, Lahore
Dr. Noureen Rizvi *[2]
Assistant Professor, Department of Urdu, The Imperial College of Business Studies, Lahore

محمد نعیم خان☆[1]
پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، دی امپیریل کالج آف بزنس اسٹڈیز، لاہور
ڈاکٹر نورین رضوی☆[2]
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، دی امپیریل کالج آف بزنس اسٹڈیز، لاہور

Correspondance:naeemkhanlhr.pk@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 28-07-2026
Accepted:28-09-2026
Online:30-09-2026

Copyright:© 2026 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: The Partition of India was one of the most traumatic events in the history of the subcontinent. Besides redrawing political and geographical boundaries, it profoundly disrupted social relations, cultural values, and established moral principles. In his post-migration short stories, Saadat Hasan Manto portrays the communal violence, forced displacement, mass killings, sexual brutality, identity crisis, and moral insensitivity caused by Partition with remarkable realism and impartiality. This study critically examines Manto's migration-related fiction, particularly Toba Tek Singh, Khol Do, Thanda Gosht, Sharifan, Yazid, and Siyah Hashiye. It argues that Manto does not present the Partition riots merely as a conflict between religious communities; rather, he portrays them as manifestations of humanity's moral failure, social disintegration, and the collapse of civilizational values. In these stories, the female

body becomes a site of communal revenge, the migrant suffers from displacement and fractured identity, and madness emerges as a metaphor for the irrationality of political decisions and social violence. The study further demonstrates that Manto avoids blaming any single nation or religious community. Instead, he exposes the brutality, prejudice, and desire for domination concealed beneath the surface of civilized human behavior.

KEYWORDS: Saadat Hasan Manto, migration fiction, Partition of India, communal riots, social crisis, moral decline, human insensitivity, identity crisis, sexual violence, Urdu short story.

اُردو افسانے کی تاریخ میں سعادت حسن منٹو کا نام حقیقت نگاری، فکری جرأت اور انسانی نفسیات کی گہری تفہیم کے حوالے سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی مسائل کو جس بے باکی اور فنی مہارت سے افسانوی قالب میں پیش کیا، وہ اُردو ادب میں ایک منفرد مثال ہے۔ منٹو نے ادب کو محض تفریح یا اخلاقی وعظ کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اسے انسانی زندگی کی پیچیدگیوں، معاشرتی تضادات اور تاریخی سانحات کی ترجمانی کا مؤثر وسیلہ قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے آج بھی اپنے عہد کی حدود سے نکل کر آفاقی انسانی مسائل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ برصغیر کی تقسیم بیسویں صدی کا ایک ایسا تاریخی سانحہ تھا جس نے لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کو متاثر کیا۔ اس واقعے نے صرف جغرافیائی سرحدیں تبدیل نہیں کیں بلکہ صدیوں سے قائم سماجی، ثقافتی اور مذہبی رشتوں کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ وسیع پیمانے پر ہونے والی ہجرت، قتل و غارت، مذہبی منافرت، خواتین پر تشدد، املاک کی تباہی اور نفسیاتی صدمات نے انسانی معاشرے کو گہرے بحران سے دوچار کر دیا۔ اس سانحے نے ادب، بالخصوص اُردو افسانے، کو نئے موضوعات، نئے سوالات اور نئے فکری زاویے عطا کیے۔

سعادت حسن منٹو ان چند ادیبوں میں شامل ہیں جنھوں نے تقسیمِ ہند کے فسادات کو محض تاریخی واقعہ نہیں سمجھا بلکہ اسے انسانی وجود، اخلاقی اقدار اور سماجی رشتوں کی شکست و ریخت کے تناظر میں دیکھا۔ ان کے افسانوں میں فسادات کی ہولناکی، انسان کے باطن میں چھپی ہوئی سفاکی، شناخت کے بحران، نفسیاتی انتشار اور تہذیبی زوال کی ایسی تصویریں ملتی ہیں جو قاری کو محض واقعے سے نہیں بلکہ اس کے انسانی مضمرات سے بھی آشنا کرتی ہیں۔ منٹو کے نزدیک اصل المیہ صرف انسانوں کی ہلاکت نہیں بلکہ انسانیت کی شکست تھی، اور یہی تصور ان کی مہاجری افسانہ نگاری کی فکری بنیاد بنتا ہے۔ منٹو کے

مہاجری افسانوں کی اہمیت اس اعتبار سے بھی مسلم ہے کہ وہ تقسیمِ ہند کے رسمی یا سرکاری بیانیے سے ہٹ کر عام انسان کی اذیت، بے وطنی، خوف، محرومی اور داخلی شکست کو موضوع بناتے ہیں۔ ان کے کردار مذہبی یا سیاسی نمائندے نہیں بلکہ ایسے انسان ہیں جو تاریخ کے جبر، معاشرتی انتشار اور اخلاقی انحطاط کا شکار ہو کر اپنی شناخت اور وجود کی کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ یہی پہلو ان کی افسانہ نگاری کو محض تاریخی دستاویز کے بجائے انسانی تجربے کی گہری ادبی تعبیر بناتا ہے۔

سعادت حسن منٹو اردو افسانے کے نمایاں تخلیق کاروں میں شمار ہوتے ہیں، جنھوں نے اپنے عہد کے سماجی، سیاسی، تہذیبی اور نفسیاتی مسائل کو بے باکی اور فنی مہارت کے ساتھ افسانے کا موضوع بنایا۔ ان کی ادبی فکر کی تشکیل ایسے زمانے میں ہوئی جب برصغیر نو آبادیاتی اثرات، سیاسی بے چینی، طبقاتی ناہمواری، مذہبی تعصبات اور تہذیبی تغیرات کی زد میں تھا۔ منٹو نے ان حالات کو صرف ظاہری واقعات کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ انسانی ذہن، کردار اور معاشرتی رویوں پر ان کے اثرات کو بھی نمایاں کیا۔ اسی بنا پر ان کے افسانوں میں فرد اور معاشرہ باہم مربوط نظر آتے ہیں، جہاں ان کی کشمکش انسانی زندگی کے مختلف المیوں کو آشکار کرتی ہے۔ اسی لیے ہی لکھتے ہیں:

"مجھ سے کوئی پوچھے منٹو تم کس جماعت میں سے ہو تو میں عرض کروں گا
میں اکیلا ہوں جس دن میرا کوئی ثانی ہو گا میں لکھنا چھوڑ دوں گا۔'"(۱)

تقسیم کے فسادات نے مذہبی شناخت کو ایک خطرناک اجتماعی ہتھیار میں تبدیل کر دیا تھا۔ منٹو نے اس صورتِ حال کو خاص حساسیت کے ساتھ محسوس کیا۔ ان کے افسانوں میں مذہب بذاتِ خود مسئلہ نہیں بنتا بلکہ مذہبی شناخت کے نام پر انسان کے خلاف تشدد اور نفرت کا رویہ بنیادی سوال بن جاتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کو صرف اس لیے دشمن سمجھنے لگتا ہے کہ اس کا مذہبی تعلق مختلف ہے۔ اس طرح وہ شناخت جو اصولاً روحانی یا تہذیبی تعلق کا اظہار ہونی چاہیے تھی، سیاسی اور اجتماعی کشمکش میں دشمنی کی بنیاد بن جاتی ہے۔ منٹو اس تضاد کو کسی تبلیغی انداز میں بیان نہیں کرتے بلکہ ایسے واقعات پیش کرتے ہیں جن سے قاری خود اس اخلاقی پیچیدگی کا سامنا کرتا ہے۔ منٹو کی مہجری افسانہ نگاری میں انسانی شناخت کا بحران بھی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ تقسیم سے قبل برصغیر میں مختلف مذہبی اور ثقافتی گروہ ایک دوسرے کے ساتھ طویل عرصے سے رہتے آئے تھے۔ تقسیم کے بعد جب سیاسی سرحدیں وجود میں آئیں تو بہت سے افراد کے لیے یہ سوال اہم ہو گیا کہ ان کی اصل شناخت کیا ہے۔ کیا وہ اپنے آبائی وطن سے پہچانے جائیں گے یا مذہبی وابستگی سے؟ کیا ماضی کی یادیں نئی سیاسی شناخت کے سامنے بے معنی ہو جائیں گی؟ منٹو کے بعض کردار انہی سوالات کی علامت بن جاتے ہیں۔ ان کے ذریعے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ جغرافیہ بدلنے سے انسان کی یادداشت، جذبات اور ماضی ختم نہیں ہوتے۔ اسی حوالے سے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" منٹو کی مہجری افسانہ نگاری کا ایک نہایت اہم نمونہ ہے۔ اس افسانے میں پاگل خانے کے کرداروں کے ذریعے تقسیم اور سرحد کے تصور پر ایسا طنزیہ سوال اٹھایا گیا ہے جو محض سیاسی فیصلے کی مخالفت نہیں بلکہ شناخت اور وطن کے

بنیادی تصور کو چیلنج کرتا ہے۔ پاگل خانے کے کرداروں کے لیے یہ فیصلہ آسانی سے قابلِ فہم نہیں کہ کون کس ملک کا شہری ہے۔ ان کی الجھن دراصل اس اجتماعی ذہنی انتشار کی علامت بن جاتی ہے جس نے تقسیم کے بعد پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ افسانے کی معنویت اس بات میں ہے کہ جس شخص کو معاشرہ پاگل سمجھتا ہے، بعض مواقع پر اسی کی نظر سے معاشرے کی نامعقولیت زیادہ واضح دکھائی دیتی ہے۔

> "مگر چور نے اس کی ایک نہ سنی اور دیوار پھاند کر غائب ہو گیا۔ مایوس ہو کر واپس آئی۔ دروازے کی دہلیز کے پاس چور کا خنجر پڑا تھا۔ اس نے اٹھا لیا اور اندر چلی گئی۔۔۔ اچانک اس کی نظریں آئینے سے دوچار ہوئیں۔ جہاں اس کا دل تھا، وہاں اس نے میان نما چمڑے کے رنگ کا خول سا بنایا ہوا تھا۔ اس نے اس پر خنجر رکھ کر دیکھا۔ خول بہت چھوٹا تھا۔ اس نے خنجر پھینک دیا اور بوتل میں سے شراب کے چار پانچ بڑے بڑے گھونٹ پی کر ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔۔۔ وہ کئی بوتلیں خالی کر چکی تھی۔ کھایا کچھ بھی نہیں تھا۔"(۲)

منٹو کا افسانہ "کھول دو" میں تقسیم کے فسادات کے دوران عورت کے وجود پر ہونے والے تشدد کو انتہائی اذیت کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں عورت صرف فسادات کا متاثرہ کردار نہیں رہتی بلکہ جنگ، تشدد، مذہبی جنون اور مردانہ طاقت کے باہمی تعلق کی علامت بن جاتی ہے۔ ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ پیش آنے والے حالات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اجتماعی تشدد کس طرح فرد کی شخصیت، جسم اور نفسیات کو توڑ دیتا ہے۔ منٹو اس واقعے کو جذباتی تقریر میں تبدیل نہیں کرتے بلکہ مختصر اور شدید فنی اظہار کے ذریعے قاری کو اس المیے کے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

> "آٹھ رضاکار نوجوانوں نے ہر طرح سکینہ کی دلجوئی کی۔ اسے کھانا کھلایا۔ دودھ پلایا اور لاری میں بٹھا دیا۔ ایک نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دے دیا۔ کیونکہ دوپٹہ نہ ہونے کے باعث وہ بہت الجھن محسوس کر رہی تھی۔ اور بار بار بانھوں سے اپنے سینے کو ڈھانکنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔"(۳)

منٹو کی ہجری افسانہ نگاری کا اہم وصف یہ ہے کہ فسادات کے ذمہ داروں کو صرف کسی مخصوص مذہبی یا سیاسی گروہ کے طور پر نہیں دیکھتے۔ ان کے ہاں بنیادی مسئلہ انسان کے اندر پیدا ہونے والی سفاکی اور اخلاقی بے حسی ہے۔ وہ دکھاتے ہیں کہ جب اجتماعی جذبات اشتعال میں تبدیل ہو جائیں تو عام انسان بھی ایسے اعمال کا مرتکب ہو سکتا ہے جنھیں معمول کے حالات میں وہ خود ناقابلِ تصور سمجھتا ہے۔ اس طرح منٹو کا موضوع صرف فسادات نہیں بلکہ وہ ذہنی اور اخلاقی ماحول

بھی ہے جو فسادات کو ممکن بناتا ہے۔ان کے افسانوں میں اخلاقی بحران کا تعلق انسانی اقدار کی کمزوری سے ہے۔ قتل، لوٹ مار، عصمت دری، انتقام اور مذہبی نفرت جیسے واقعات صرف جرائم نہیں رہتے بلکہ معاشرے کی اخلاقی ساخت کے زوال کی علامت بن جاتے ہیں۔ منٹو اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ تہذیب کی ظاہری سطح کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو، اگر انسان کے اندر دوسرے انسان کے لیے احترام اور ہمدردی باقی نہ رہے تو تہذیبی ڈھانچہ بہت جلد تشدد میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ یہی نکتہ ان کی مہاجری افسانہ نگاری کو محض تاریخی ادب سے آگے لے جاتا ہے۔

منٹو کی تخلیقات میں عورت کا کردار بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ تقسیم کے دوران عورتوں کو جسمانی، جنسی اور نفسیاتی تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ منٹو نے عورت کو محض مظلوم اور خاموش کردار بنا کر پیش نہیں کیا بلکہ اس کے جسم اور وجود پر ہونے والے حملے کو پورے معاشرتی نظام کے اخلاقی بحران سے جوڑا۔ ان کے ہاں عورت کے ساتھ ہونے والا تشدد دراصل اس معاشرے کے رویے کو بے نقاب کرتا ہے جو اپنی سیاسی یا مذہبی فتح کے اظہار کے لیے دوسرے گروہ کی عورت کے جسم کو میدانِ جنگ بنا دیتا ہے۔ اس پہلو سے منٹو کی افسانہ نگاری میں صنفی اور اخلاقی سوالات ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں۔

مہجری تجربے کا ایک اور اہم پہلو نفسیاتی صدمہ ہے۔ ہجرت کرنے والا شخص صرف اپنا گھر نہیں چھوڑتا بلکہ وہ اپنے ساتھ ماضی کی یادیں، رشتوں کی یادداشت، خوف اور نقصان کے تجربات بھی لے کر چلتا ہے۔ منٹو کے کرداروں میں بے چینی، خاموشی، اضطراب، خوف اور غیر معمولی رویے اسی نفسیاتی دباؤ کی مختلف صورتیں ہیں۔ بعض کردار خارجی طور پر زندہ رہتے ہوئے بھی اندر سے ٹوٹ چکے ہوتے ہیں۔ اس طرح منٹو ہجرت کے اس پہلو کو سامنے لاتے ہیں جو سرکاری یا تاریخی بیانیوں میں عموماً نظر انداز ہو جاتا ہے۔ "ٹھنڈا گوشت" میں بھی تقسیم کے فسادات کے پس منظر میں انسانی خواہش، تشدد، جرم، احساسِ جرم اور اخلاقی شکست کے پیچیدہ پہلو سامنے آتے ہیں۔ یہاں منٹو کا مقصد محض ایک ہولناک واقعہ بیان کرنا نہیں بلکہ یہ دکھانا ہے یہ صورتِ حال واضح کرتی ہے کہ مسلسل تشدد انسانی باطن اور ذہنی کیفیت کو کس حد تک متاثر کر سکتا ہے۔ جسمانی اذیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسیاتی اور اخلاقی الجھن کردار کے اندرونی بحران کو نمایاں کرتی ہے۔ یوں افسانہ اجتماعی فسادات کے اثرات کو فرد کی نفسیاتی تشکیل کے ساتھ مربوط کر دیتا ہے۔

> "لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کر سکا۔
> جتنے گر اور جتنے داؤ اسے یاد تھے، سب کے سب اس نے پٹ جانے والے
> پہلوان کی طرح استعمال کر دیے، پر کوئی کارگر نہ ہوا۔ کلونت کورنے، جس
> کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخود بج رہے تھے، غیر ضروری چھیڑ چھاڑ
> سے تنگ آکر کہا، "ایشر سیاں، کافی پھینٹ چکا ہے، اب پتا پھینک!۔" (۴)

منٹو کی مہاجری افسانہ نگاری کی تاثیر میں ان کی زبان اور اسلوب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ اختصار کے ذریعے کم الفاظ میں گہرا معنوی اثر پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مکالمے کرداروں کی نفسیات کے ساتھ ساتھ معاشرتی فضا کو بھی نمایاں کرتے ہیں، جب کہ طنز محض مزاح کا ذریعہ نہیں بل کہ انسانی اور سماجی تضادات کو آشکار کرنے کا وسیلہ بنتا ہے۔ بعض افسانوں کا اختتام پورے متن کے مفہوم کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ منٹو کی حقیقت نگاری صرف واقعات کی ظاہری عکاسی تک محدود نہیں بل کہ اس میں گہری نفسیاتی بصیرت بھی شامل ہے۔ وہ تاریخی اور اجتماعی واقعات کے انسانی باطن پر مرتب ہونے والے اثرات کو نمایاں کرتے ہیں۔ چناں چہ ان کے ہاں جسمانی تشدد کے ساتھ ذہنی اذیت، اجتماعی بحران کے ساتھ انفرادی اضطراب اور تاریخی المیے کے ساتھ اخلاقی سوال بھی سامنے آتا ہے۔ تقسیمِ ہند کے تجربے کو معنوی وسعت دینے میں منٹو کے ہاں طنز اور علامت کا بھی اہم کردار ہے۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں پاگل خانہ محض ایک ادارہ نہیں رہتا بل کہ تقسیم کے سیاسی اور سماجی نظام کی علامتی تصویر بن جاتا ہے۔ اسی طرح جسم، لاش، گھر، سرحد، سفر اور خاموشی جیسے عناصر بعض افسانوں میں اپنے ظاہری مفہوم سے آگے بڑھ کر انسانی المیے کی علامت بن جاتے ہیں۔ یوں منٹو یہ واضح کرتے ہیں کہ تقسیم کا بحران صرف خارجی دنیا تک محدود نہیں تھا بل کہ اس نے انسان کے ذہن، احساس اور داخلی زندگی کو بھی متاثر کیا۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' میں پاگل خانے کا منظر اس صورتِ حال کی نمایاں مثال ہے:

> "ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان، اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنی پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا، ''میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں۔۔۔ میں اس درخت پر ہی رہوں گا۔''(۵)

منٹو کے افسانوں میں تقسیمِ ہند کا سانحہ اس لیے بھی اہم ہے کہ وہ تاریخ کے سرکاری بیانیے سے مختلف ایک انسانی تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ سرحدیں بنانے والے سیاسی فیصلے چند صفحات میں بیان کیے جا سکتے ہیں، لیکن ان فیصلوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انسانی تباہی کو سمجھنے کے لیے انفرادی تجربات کا مطالعہ ضروری ہے۔ منٹو کے افسانے اسی انفرادی سطح پر تاریخ کو محسوس کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ان کے کردار تاریخ کے بڑے واقعات کے خاموش اعداد نہیں بلکہ اپنی الگ شناخت، دکھ اور تجربے رکھنے والے انسان ہیں۔ منٹو کی ہجری افسانہ نگاری میں ایک بنیادی فکری سوال انسان اور انسانیت کا ہے۔ تقسیم کے دوران مذہبی، سیاسی اور قومی شناختیں اتنی طاقتور ہو گئیں کہ فرد کی انسانی شناخت پس پشت چلی گئی۔ منٹو نے اسی صورتِ حال کو اپنی تخلیقات میں مختلف انداز سے پیش کیا۔ ان کے یہاں انسان کبھی قاتل بن جاتا ہے، کبھی مقتول، کبھی مہاجر، کبھی پناہ گزین اور کبھی ایسا شخص جو اپنے ہی ماضی اور حال کے درمیان معلق رہ جاتا ہے۔ اس

پیچیدہ انسانی صورتِ حال کے ذریعے منٹو یہ احساس پیدا کرتے ہیں کہ سیاسی اور مذہبی تقسیم کے باوجود انسانی دکھ کی بنیادی نوعیت مشترک رہتی ہے۔

تہذیبی اور انسانی ڈھانچے کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ برطانوی اقتدار کے اختتام اور دو نئی ریاستوں کے قیام کے ساتھ ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہوئی جس میں مذہبی شناخت سیاسی وابستگی کے ساتھ جڑ گئی۔ اس تبدیلی نے ان علاقوں میں بھی بے یقینی پیدا کی جہاں مختلف مذہبی اور سماجی گروہ طویل عرصے سے باہمی میل جول کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ سیاسی کشمکش کے ساتھ ساتھ افواہوں، باہمی بداعتمادی اور خوف نے حالات کو مزید پیچیدہ بنایا اور بالآخر متعدد علاقوں میں تشدد کی صورت اختیار کی۔ تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات کی شدت اور وسعت نے معمول کی معاشرتی زندگی کو شدید متاثر کیا۔ شہروں اور دیہات میں قتل وغارت، لوٹ مار، آتش زنی اور جبری نقل مکانی کے واقعات رونما ہوئے۔ بہت سے خاندان اپنے گھروں سے بے دخل ہوئے اور انہیں نامعلوم مقامات کی طرف سفر کرنا پڑا۔ یہ سفر صرف جغرافیائی نقل مکانی نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ خوف، بے یقینی اور مستقبل کے بارے میں اضطراب بھی وابستہ تھا۔ جن لوگوں نے اپنے آبائی علاقوں کو چھوڑا، ان کے لیے گھر صرف ایک عمارت نہیں تھا بلکہ اس میں ان کی یادیں، رشتے، ثقافتی وابستگیاں اور زندگی بھر کے تجربات موجود تھے۔ اس لیے گھر سے محرومی دراصل ایک مکمل طرزِ زندگی سے محرومی بھی تھی۔ تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ہجرت نے معاشرتی رشتوں کی ساخت کو بھی بدل دیا۔ ایسے خاندان جو نسلوں سے ایک ہی علاقے میں آباد تھے، اچانک ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ پڑوسیوں کے درمیان اعتماد کمزور ہوا اور مذہبی شناخت نے سماجی تعلقات پر اثر انداز ہونا شروع کیا۔ بعض مقامات پر وہ افراد جو ایک دوسرے کے ساتھ معمول کی زندگی گزارتے تھے، حالات کے دباؤ میں ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے۔ اس تبدیلی نے انسانی تعلقات کے بنیادی تصور کو متاثر کیا اور یہ سوال پیدا کیا کہ معاشرتی ہم آہنگی کتنی دیر تک قائم رہ سکتی ہے جب سیاسی اور مذہبی اختلافات کو دشمنی میں تبدیل کر دیا جائے۔ افسانہ آخری سلیوٹ کا ایک مختصر سا اقتباس دیکھیے:

> "جب ہنسی کا دور ختم ہوا تو ادھر سے رام سنگھ کی آواز بلند ہوئی، ''دیکھو یار ہمیں چائے پینی ہے!'' رب نواز بولا، ''پیو۔۔۔ عیش کرو۔'' رام سنگھ چلایا، ''اوئے عیش کس طرح کریں۔۔۔ سامان تو ہمارا ادھر پڑا ہے۔'' رب نواز نے پوچھا''کدھر؟'' رام سنگھ کی آواز آئی، ''ادھر۔۔۔ جدھر تمہارا فائر ہمیں اڑا سکتا ہے۔'' رب نواز ہنسا، ''تو کیا چاہتے ہو تم۔۔۔ خنزیر کی دُم!'' رام سنگھ بولا، ''ہمیں سامان لے آنے دے۔''(٦)

فسادات نے طبقاتی فرق کو بھی ختم نہیں کیا بلکہ بعض صورتوں میں اسے نئے انداز سے نمایاں کیا۔ بحران کے دوران معاشرے کے مختلف طبقات نے مختلف نوعیت کے مسائل کا سامنا کیا۔ کچھ لوگ وسائل اور تعلقات کی وجہ سے نسبتاً

محفوظ رہے جب کہ عام اور کمزور افراد زیادہ شدید خطرات سے دوچار ہوئے۔ منٹو اگرچہ ہر افسانے میں طبقاتی تجزیہ براہِ راست نہیں کرتے، لیکن ان کے کرداروں کے انتخاب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کی توجہ سماج کے ان طبقات کی طرف زیادہ ہے جن کی آواز عمومی تاریخی بیانیے میں کم سنائی دیتی ہے۔ منٹو کی افسانہ نگاری میں سماجی بحران کا ایک بنیادی نتیجہ اخلاقی بے حسی بھی ہے۔ مسلسل تشدد انسان کو دوسروں کے دکھ سے بے نیاز کر سکتا ہے۔ جب روزانہ قتل، لاشیں اور تباہی دیکھنے کو ملے تو حساسیت بتدریج کم ہونے کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ منٹو اسی بے حسی کو اپنے افسانوں میں بے نقاب کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بعض اوقات سب سے خوفناک چیز خود قتل نہیں بلکہ یہ ہوتی ہے کہ قتل کے بعد بھی زندگی معمول کی طرح چلتی رہتی ہے اور معاشرہ اس سانحے کو جلد فراموش کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کے افسانوں میں طنز ایک اہم فنی وسیلہ بن جاتا ہے۔ وہ بعض حالات کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ان کی نامعقولیت خود واضح ہو جاتی ہے۔ "سیاہ حاشیے" کے مختصر افسانوی ٹکڑوں میں تقسیم کے دوران انسانی رویوں کی ایسی جھلکیاں سامنے آتی ہیں جن میں سفاکی، خود غرضی، مذہبی جنون اور اخلاقی بے حسی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان مختصر تحریروں کی قوت اس بات میں ہے کہ منٹو طویل واقعہ بیان کیے بغیر ایک پورے عہد کی ذہنی کیفیت کو چند لمحوں میں نمایاں کر دیتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

> "چلتی گاڑی روک لی گئی جو دوسرے مذہب کے تھے۔ ان کو نکال نکال کر تلواروں اور گولیوں سے ہلاک کر دیا گیا۔ اس سے فارغ ہو کر گاڑی کے باقی مسافروں کی حلوئے دودھ اور پھلوں سے تواضع کی گئی گاڑی چلنے سے پہلے تواضع کرنے والوں کے منتظم نے مسافروں کو مخاطب کر کے کہا بھائیو اور بہنوں ہمیں گاڑی کی آمد کی اطلاع بہت دیر میں ملی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جس طرح چاہتے تھے اُس طرح آپ کی خدمت نہ کر سکے۔"(۷)

منٹو کے ہاں سماجی بحران کی تصویر کشی میں زبان بھی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وہ مصنوعی ادبی زبان کے بجائے کردار اور ماحول کے مطابق زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس سے افسانے کے واقعات زیادہ حقیقی محسوس ہوتے ہیں اور کردار سماج کے حقیقی افراد کے قریب دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے مکالموں میں روزمرہ لہجہ، طنز، خوف اور بے یقینی کی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ اس طرح زبان خود سماجی حقیقت کی نمائندگی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ منٹو کے افسانوں میں سماجی بحران کا تعلق فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق سے بھی ہے۔ معاشرہ فرد کے رویے کو متاثر کرتا ہے، لیکن فرد بھی معاشرتی اقدار کو تشکیل دیتا ہے۔ فسادات کے دوران جب فرد اجتماعی نفرت کا حصہ بنتا ہے تو وہ بحران کو مزید بڑھاتا ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی فرد گروہی تعصب سے بالاتر ہو کر دوسرے انسان کی مدد کرتا ہے تو وہ اسی بحران کے اندر انسانیت کی ایک متبادل صورت پیدا کرتا ہے۔ منٹو کی افسانہ نگاری میں یہ امکان مکمل طور پر ختم نہیں ہوتا کہ انسان انتہائی مشکل حالات میں بھی

اپنی اخلاقی شناخت برقرار رکھ سکتا ہے۔ منٹو کی مہاجری افسانہ نگاری میں سماجی بحران ایک ہمہ گیر صورت اختیار کرتا ہے۔ اس بحران میں مذہبی تقسیم، ہجرت، شناخت کا مسئلہ، انسانی رشتوں کی شکست، عورت پر تشدد، معاشی بے یقینی، اجتماعی خوف اور اخلاقی بے حسی سب ایک دوسرے سے مربوط دکھائی دیتے ہیں۔ منٹو ان تمام عناصر کو الگ الگ مسائل کے طور پر نہیں بلکہ ایک ایسے اجتماعی تجربے کے طور پر دیکھتے ہیں جس نے انسان اور معاشرے کے بنیادی تعلق کو متاثر کیا۔ یہی جامع سماجی شعور ان کی افسانہ نگاری کو تقسیمِ ہند کے ادب میں نمایاں مقام عطا کرتا ہے اور اسے محض تاریخی واقعات کی بازگشت کے بجائے انسانی معاشرے کے گہرے مطالعے میں تبدیل کر دیتا ہے۔

تقسیمِ ہند کے فسادات نے انسانی رشتوں کی بنیادوں کو جس شدت سے متاثر کیا، اس کا عکس سعادت حسن منٹو کی متعدد تخلیقات میں نمایاں ہوتا ہے۔ منٹو کے ہاں فسادات کا المیہ صرف قتل و غارت یا ہجرت کے واقعات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے اثرات انسانی تعلقات، خاندانی وابستگی، مذہبی شناخت، تہذیبی اقدار اور فرد کے باطن تک پھیل جاتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں یہ احساس نمایاں ہے کہ اجتماعی تشدد کے نتیجے میں صرف انسان نہیں مرتے بلکہ ان کے ساتھ وہ اعتماد، محبت اور تہذیبی رشتے بھی مجروح ہوتے ہیں جو معاشرے کو ایک مربوط اکائی بناتے ہیں۔ منٹو کی افسانوی دنیا میں اس صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے "شریفن" ایک اہم متن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس افسانے میں تقسیم کے فسادات کے دوران انسانی زندگی اور عورت کے وجود پر پڑنے والے اثرات کو نہایت شدید صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہاں ایک فرد کا المیہ پورے اجتماعی ماحول کے المیے سے الگ نہیں رہتا۔ کرداروں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جب معاشرہ مذہبی اور گروہی تعصب کے زیرِ اثر آ جائے تو انسانی زندگی کی بنیادی حرمت کس طرح متاثر ہوتی ہے۔ "شریفن" میں عورت کا کردار محض ایک مظلوم فرد کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس کے ذریعے منٹو نے اس اجتماعی ذہنیت کو بے نقاب کیا ہے جس میں مخالف گروہ سے وابستہ عورت بھی دشمنی اور انتقام کے دائرے میں شامل کر دی جاتی ہے۔ اس صورتِ حال میں عورت کی انفرادی شناخت، اس کے جذبات اور اس کی انسانی حیثیت پسِ پشت چلی جاتی ہے۔ اس کا جسم اور وجود ایک ایسے اجتماعی تصادم کا حصہ بن جاتا ہے جس میں اس کی اپنی مرضی اور شخصیت کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ منٹو عورت کے المیے کو معاشرے کے اخلاقی زوال سے جوڑ دیتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "قاسم کے ہونٹ بھینچ گئے۔ گرج کر اس نے پوچھا یہ کون ہو تم ہے۔ لڑکی نے خشک ہونٹوں پر نہ بات پھیری اور جواب دیا.... ہندوت قاسم تن کر کھڑا ہو گیا۔ شعلہ بار آنکھوں سے اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ جس کی عمر چودہ یا پندرہ برس کی تھی اور ہاتھ سے گنڈاسا گرا دیا۔ پھر وہ عقاب کی طرح جھپٹا اور اس لڑکی کو دھکیل کر اندر دالان میں لے گیا۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے دیوانہ وار کپڑے نوچنے شروع کئے۔ دھجیاں اور چندیاں یوں اڑنے

لگیں جیسے کوئی روئی دھنک رہا ہے۔۔۔۔ تقریباً آدھا تھانہ قاسم اپنا انتقام لینے میں مصروف رہا۔ لڑکی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس لیے کہ وہ فرش پر کرتے ہی سہوش ہوئی تھی۔"(۸)

اس افسانے کا اہم پہلو یہ ہے کہ منٹو تشدد کو صرف ایک فرد کے عمل کے طور پر نہیں دیکھتے بلکہ اس کے پیچھے موجود اجتماعی ذہنیت کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ فسادات میں ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف انتقام کی منطق اختیار کرتا ہے اور اس منطق میں فرد کی انفرادی ذمہ داری کمزور پڑنے لگتی ہے۔ ہر ظلم کسی پہلے ظلم کا جواب قرار پاتا ہے اور اس طرح تشدد کا سلسلہ ختم ہونے کے بجائے مسلسل بڑھتا جاتا ہے۔ منٹو کے افسانوی کردار اسی انتقامی ذہنیت کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔

یہاں انسانی رشتوں کی شکست بھی واضح ہوتی ہے۔ عام حالات میں انسان دوسرے انسان کو اس کی ذات، کردار اور تعلق کی بنیاد پر پہچانتا ہے، لیکن فسادات کے دوران مذہبی شناخت اس پہچان پر غالب آ جاتی ہے۔ ایک شخص اچانک صرف اس لیے خطرہ بن جاتا ہے کہ وہ دوسرے مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ اس طرح فرد کی مکمل انسانی شخصیت ایک گروہی شناخت میں سمٹ جاتی ہے۔ منٹو کی افسانہ نگاری میں یہی عمل اخلاقی اور تہذیبی بحران کی بنیادی علامت بنتا ہے۔ "خدا کی قسم" اس حوالے سے ایک اور اہم متن ہے۔ اس افسانے میں تقسیم اور ہجرت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذہنی کیفیت کو انسانی رشتے اور یادداشت کے حوالے سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ہجرت کے دوران بچھڑنے والے افراد کے لیے ماضی محض یاد نہیں رہتا بلکہ ایک مسلسل داخلی تجربہ بن جاتا ہے۔ انسان نئی جگہ پر زندگی شروع کرنے کے باوجود اپنے گزرے ہوئے رشتوں، گھروں اور عزیزوں کو ذہن سے مکمل طور پر نکال نہیں پاتا۔ اس طرح ماضی اور حال کے درمیان ایک مستقل کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"میں نے مناسب نہ سمجھا۔ میں اس کی موہوم تلاش جو اس کی زندگی کا واحد سہارا تھی۔ میں اس سے چھینا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسے ایک وسیع و عریض پاگل خانے سے جس میں وہ میلوں کی مسافت طے کر کے اپنے پاؤں کے آبلوں کی پیاس بجھاسکتی تھی، اٹھا کر ایک مختصر سی چار دیواری میں قید کرانا نہیں چاہتا تھا۔ آخری بار میں نے اسے امرتسر میں دیکھا۔ اس کی شکستہ حالی کا یہ عالم تھا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے پاکستان لے جاؤں گا اور پاگل خانے میں داخل کرادوں گا۔"(۹)

"خدا کی قسم" کے تناظر میں مذہبی شناخت اور انسانی تعلق کے درمیان پیدا ہونے والا تضاد بھی اہم ہے۔ تقسیم کے بعد مذہبی شناخت کو سیاسی اور اجتماعی سطح پر نئی اہمیت حاصل ہوئی، لیکن انسانی جذبات ہمیشہ اسی تقسیم کے مطابق نہیں چلتے۔ پرانے تعلقات، محبت، دوستی اور یادداشت مذہبی سرحدوں کو قبول کرنے سے انکار کر سکتی ہیں۔ منٹو اسی تضاد کے ذریعے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا انسان کے جذبات کو بھی سیاسی فیصلوں کے ذریعے تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ یہ سوال منٹو کی پوری مجموعی افسانہ نگاری میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ سرحد ایک سیاسی حقیقت ہے، لیکن انسانی یادداشت ایک ایسی داخلی حقیقت ہے جسے سرحد کے ذریعے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے مہاجر کردار اکثر دو دنیاوں کے درمیان کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ ایک دنیا اس کا ماضی ہے، دوسری اس کا موجودہ ماحول۔ ماضی میں اس کے رشتے، تہذیبی وابستگیاں اور یادیں موجود ہیں جبکہ حال میں بقا، شناخت اور نئی زندگی کے مسائل موجود ہیں۔ اس دوئی سے پیدا ہونے والی ذہنی کیفیت منٹو کے کرداروں کو گہری انسانی معنویت عطا کرتی ہے۔

منٹو کی بعض تخلیقات میں تہذیبی اقدار کے بحران کا تعلق مذہبی منافرت سے بھی ہے۔ افسانہ "یزید" کے حوالے سے منٹو کے فکری رویے کو دیکھتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ تاریخی اور مذہبی علامتوں کو محض عقیدتی یا روایتی سطح پر نہیں دیکھتے بلکہ ان کے ذریعے انسانی رویوں اور اخلاقی سوالات کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تاریخی کردار اور علامتیں بعض اوقات موجودہ انسانی رویوں کو سمجھنے کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔ یوں ماضی ایک زندہ فکری مسئلہ بن کر حال کے سامنے آتا ہے۔ افسانے کا اختتام ان الفاظ میں ہوتا ہے:

> "بختو دائی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کریم داد نعرے لگاتا اندر گھر میں داخل ہوا۔ جیناں چارپائی پر لیٹی تھی۔۔ پہلے سے کسی قدر زرد، اس کے پہلو میں ایک گل گوتھنا سا بچہ چپڑ چپڑ انگوٹھا چوس رہا تھا۔ کریم داد نے اس کی طرف پیار بھری فخریہ نظروں سے دیکھا اور اس کے ایک گال کو انگلی سے چھیڑتے ہوئے کہا، "اوئے میرے یزید!" جیناں کے منہ سے ہلکی سی متعجب چیخ نکلی۔۔۔"(۱۰)

منٹو کی تخلیقات میں شناخت کا بحران صرف مہاجروں تک محدود نہیں بلکہ تقسیم کے بعد پورے معاشرے کے لیے ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ مذہبی شناخت کو مرکزی حیثیت ملنے کے باعث فرد کی دوسری شناختیں پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔ انسان کو اس کے مذہب کے ذریعے پہچاننے کا رجحان بڑھتا ہے اور اس کی شخصیت کے دوسرے پہلو کم اہم تصور ہونے لگتے ہیں۔ منٹو کی افسانہ نگاری اس عمل کے انسانی نتائج کو نمایاں کرتی ہے۔ ان کے ہاں انسان کو کسی ایک اجتماعی شناخت میں محدود کرنا ہمیشہ ایک مسئلہ پیدا کرتا ہے، کیونکہ انسان کی شخصیت اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ موذیل" اس

پیچیدگی کو سمجھنے کے لیے ایک قابلِ توجہ افسانہ ہے۔ اس میں مذہبی شناخت، عورت کی خود مختاری، محبت اور انسانی وابستگی کے درمیان پیدا ہونے والا تضاد سامنے آتا ہے۔ موذیل کا کردار روایتی مذہبی اور سماجی خانوں میں آسانی سے فٹ نہیں ہوتا۔ اس کی شخصیت ان تصورات کو چیلنج کرتی ہے جو انسان کو صرف مذہب، جنس یا معاشرتی کردار کی بنیاد پر متعین کرتے ہیں۔ تقسیم کے ماحول میں یہ سوال مزید اہم ہو جاتا ہے کہ کیا کسی انسان کی مکمل شناخت صرف اس کے مذہب سے طے کی جا سکتی ہے؟ موذیل کی شخصیت میں ایک غیر معمولی آزاد مزاجی دکھائی دیتی ہے۔ وہ سماج کے مقرر کردہ کرداروں کو آسانی سے قبول نہیں کرتی اور اپنے فیصلے خود کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں مذہبی شناخت اور معاشرتی توقعات ایک مختلف طرزِ زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ منٹو اس تضاد کے ذریعے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ شناخت ایک پیچیدہ انسانی حقیقت ہے جسے صرف مذہبی یا سماجی خانوں میں محدود نہیں کیا جا سکتا:

> "باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کیے سگرٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصے میں کہا، "تم بہت ذلیل ہو۔" موذیل مسکرائی، "یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔۔۔ اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں۔" پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا، "یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے کیس ہیں۔" (۱۱)

منٹو کے ہاں شناخت کا مسئلہ طبقاتی سطح پر بھی ظاہر ہوتا ہے۔ "بابو گوپی ناتھ" جیسے افسانے میں معاشرتی تعلقات، مفاد، جذبات اور فرد کی سماجی حیثیت کے درمیان پیچیدہ رشتے سامنے آتے ہیں۔ اگرچہ یہ افسانہ تقسیمِ ہند کے فسادات پر براہِ راست مبنی نہیں، لیکن اس کے کرداروں کے ذریعے منٹو کے اس وسیع فکری رجحان کو سمجھا جا سکتا ہے جس میں وہ سماجی شناخت کے ظاہری تصورات اور انسانی حقیقت کے درمیان فرق کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان کے کردار بظاہر کسی مخصوص سماجی طبقے یا کردار سے وابستہ ہوتے ہیں، لیکن ان کے اندرونی محرکات کہیں زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں۔ "بابو گوپی ناتھ" میں انسان کو صرف ایک اخلاقی فیصلے کے ذریعے سمجھنے کے بجائے اس کی سماجی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہی منٹو کے فن کا بنیادی وصف ہے۔ وہ کردار کے بارے میں فوری فیصلہ صادر کرنے کے بجائے اس کے رویے کے پیچھے موجود حالات اور محرکات کو سامنے لاتے ہیں۔ تقسیم کے بعد مہاجر کرداروں کے مطالعے میں یہی طریقہ خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ مہاجر کی نفسیات بھی محض مظلومیت یا بے بسی سے مکمل طور پر بیان نہیں ہو سکتی:

"منٹو صاحب! میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں میری دلی خواہش ہے کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے، اچھی طرح ہوشیار ہو جائے۔ میں اس کے نام آج ہی بنک میں دس ہزار روپیہ جمع کرانے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے دس دن کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہو گی۔ سردار اس کی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال لے گی۔۔۔ آپ بھی اسے سمجھایئے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موٹر خریدی ہے، سردار اسے ہر روز شام کو اپولو بندر لے جاتی ہے لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ سینڈو آج بڑی مشکلوں سے محمد شفیق کو یہاں لایا ہے۔"(۱۲)

سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری کا بنیادی امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی واقعات کو محض خارجی واقعات کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ ان کے انسانی اثرات کو اپنی تخلیقات کا مرکز بنایا۔ تقسیمِ ہند کے فسادات ان کے لیے صرف دو قومی ریاستوں کے قیام یا سرحدوں کی تشکیل کا واقعہ نہیں تھے بلکہ انسانی تہذیب، اخلاقی اقدار اور اجتماعی شعور کی ایک بڑی آزمائش تھے۔ منٹو کا فکری موقف اسی تجربے سے تشکیل پاتا ہے کہ تاریخ کے بڑے فیصلوں کا حقیقی بوجھ عام انسان اٹھاتا ہے۔ سیاست دان سرحدیں بناتے ہیں، ریاستیں وجود میں آتی ہیں، نظریات تشکیل پاتے ہیں، لیکن ان تبدیلیوں کی قیمت انسان اپنے گھر، رشتوں، جسم، نفسیات اور زندگی سے ادا کرتا ہے۔ منٹو کے فکری رویے میں انسان مرکزیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ انسان کو کسی مذہبی، سیاسی یا قومی شناخت میں مکمل طور پر محدود کرنے کے بجائے اسے ایک زندہ اور پیچیدہ وجود کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کی بنیادی شناخت اس کی انسانیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی افسانہ نگاری میں مذہبی تعصب، سیاسی تقسیم، گروہی نفرت اور اخلاقی منافقت پر تنقیدی نظر ملتی ہے۔ وہ کسی مخصوص گروہ کو مکمل طور پر مجرم اور کسی دوسرے گروہ کو مکمل طور پر معصوم قرار دینے کے بجائے اس ذہنیت کا جائزہ لیتے ہیں جو انسان کو دوسرے انسان کے خلاف کھڑا کرتی ہے۔

منٹو کے فکشن میں "فحاشی" کا سوال بھی محض جنسی موضوعات تک محدود نہیں رہتا۔ ان کے ہاں اصل بے حیائی بعض اوقات اس معاشرتی رویے میں موجود ہوتی ہے جو ظلم کو معمول سمجھ لیتا ہے۔ اگر ایک معاشرہ قتل، تشدد، عورت کی تذلیل اور انسانی استحصال کو برداشت کر سکتا ہے لیکن ان واقعات کی ادبی عکاسی کو فحش قرار دیتا ہے تو منٹو اس اخلاقی تضاد پر سوال اٹھاتے ہیں۔ ان کی حقیقت نگاری دراصل معاشرے کے اسی چھپے ہوئے چہرے کو سامنے لانے کی کوشش ہے۔ افسانہ "بو" سے اقتباس دیکھیے:

"ایسی کپکپاہٹوں سے رندھیر کا سیکڑوں بار واسطہ پڑ چکا تھا۔ وہ ان کو بخوبی جانتا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم و نازک اور سخت سینوں سے اپنا سینہ ملا کر کئی کئی راتیں گزار چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ بھی رہ چکا تھا جو بالکل اس کے ساتھ لپٹ کر گھر کی وہ ساری باتیں سنا دیا کرتی تھیں جو کسی غیر کے لیے نہیں ہوتیں۔ وہ ایسی لڑکیوں سے بھی جسمانی تعلق قائم کر چکا تھا جو ساری مشقت کرتی تھیں اور اسے کوئی تکلیف نہیں دیتی تھیں۔۔۔ لیکن یہ گھاٹن لڑکی جو پیڑ کے نیچے بھیگی ہوئی کھڑی تھی اور جسے اس نے اشارے سے اوپر بلا لیا تھا، مختلف تھی۔(۱۳)

منٹو کے فکری موقف میں حقیقت نگاری کو بھی بنیادی مقام حاصل ہے۔ وہ زندگی کو اس کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اس کی بدصورتی، سفاکی اور پیچیدگی سمیت دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادیب کا کام یہ نہیں کہ وہ معاشرے کی ایسی تصویر بنائے جو دیکھنے میں خوش گوار ہو، بلکہ اسے اس حقیقت کو بھی پیش کرنا چاہیے جس سے معاشرہ خود نظریں چرانا چاہتا ہے۔ تقسیم کے فسادات کے حوالے سے یہ رویہ خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اگر ادب صرف قومی فتح، سیاسی کامیابی یا ہجرت کی رسمی داستان تک محدود رہتا تو انسانی المیے کی اصل شدت سامنے نہ آتی۔ منٹو کی حقیقت نگاری دراصل اخلاقی بے حسی کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ وہ قاری کو ایسے مناظر دکھاتے ہیں جنہیں دیکھنا آسان نہیں۔ اس دشواری کا مقصد محض چونکانا نہیں بلکہ انسانی حساسیت کو بیدار کرنا ہے۔ ان کے افسانوں میں قاری کو بار بار ایسے مقام پر لایا جاتا ہے جہاں اسے اپنے اخلاقی تصورات پر نظر ثانی کرنا پڑتی ہے۔ وہ یہ سوال اٹھانے پر مجبور ہوتا ہے کہ جس عمل کو ہم کسی خاص گروہ کے بارے میں درست سمجھتے ہیں، کیا وہی عمل اگر کسی دوسرے انسان کے ساتھ ہو تو بھی درست رہے گا؟

منٹو کے فکری نظام میں فرد اور ہجوم کا تضاد بھی اہم ہے۔ فرد کے اندر ضمیر، تجربہ اور ذاتی احساس موجود ہوتا ہے، جبکہ ہجوم اسے اجتماعی جذبات کے تابع کر سکتا ہے۔ فسادات کے ماحول میں یہی ہجوم ایک خطرناک قوت بن جاتا ہے۔ منٹو اس ذہنی عمل کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں فرد اپنی انفرادی ذمہ داری سے دست بردار ہو کر گروہی جذبات کا حصہ بن جاتا ہے۔ ان کے ہاں اجتماعی شناخت کی مخالفت نہیں بلکہ اس شناخت کے اس انتہاپسند استعمال پر تنقید ہے جو انسان کو دوسرے انسان کی جان اور عزت کا دشمن بنا دے۔ منٹو کے فکری موقف میں عورت کی حیثیت بھی اہم ہے۔ انہوں نے عورت کو صرف مظلوم یا مثالی کردار کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ اسے خواہش، ارادے، کمزوری، طاقت اور اپنی شخصیت رکھنے والے انسان کے طور پر دکھایا۔ ان کی بعض عورتیں معاشرتی معیار سے انحراف کرتی ہیں اور اسی انحراف کے ذریعے سماج کے دوہرے اخلاق کو بے نقاب کرتی ہیں۔ تقسیم کے فسادات میں عورت کے جسم پر ہونے والے تشدد کو منٹو نے اجتماعی اخلاقی بحران کے ساتھ جوڑا۔ اس طرح عورت کا مسئلہ ان کے ہاں صرف صنفی مسئلہ نہیں رہتا بلکہ طاقت، مذہب،

جنگ اور معاشرتی اخلاقیات کے باہمی تعلق کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ منٹو کا ایک اہم فکری پہلو یہ بھی ہے کہ وہ انسان کے اندر موجود تضادات کو قبول کرتے ہیں۔ ان کے کردار نہ مکمل فرشتے ہیں اور نہ مکمل شیطان۔ ایک شخص میں ہمدردی اور خود غرضی، محبت اور نفرت، خوف اور بہادری بیک وقت موجود ہو سکتے ہیں۔ یہی انسانی پیچیدگی منٹو کے افسانوں کو نفسیاتی گہرائی عطا کرتی ہے۔ وہ کرداروں کو آسان اخلاقی خانوں میں تقسیم کرنے کے بجائے ان کے داخلی محرکات کو سامنے لاتے ہیں۔ یہ فکری رویہ آج کے دور میں بھی غیر معمولی معنویت رکھتا ہے۔ موجودہ دنیا میں مذہبی، نسلی، قومی اور سیاسی شناختیں اب بھی انسانی تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ مختلف معاشروں میں گروہی تعصب، نفرت انگیز بیانیے، جبری نقل مکانی، جنگ اور سیاسی کشمکش کے نتیجے میں عام انسان متاثر ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں منٹو کی یہ بات زیادہ اہم محسوس ہوتی ہے کہ کسی بھی اجتماعی شناخت کو انسانی جان اور وقار سے بالاتر نہیں ہونا چاہیے۔

آج جب دنیا میں معلومات کی رفتار بہت بڑھ چکی ہے، افواہ اور نفرت بھی پہلے سے زیادہ تیزی سے پھیل سکتی ہے۔ تقسیم کے زمانے میں افواہیں اور خوف جس طرح اجتماعی تشدد کو بڑھاتے تھے، آج یہی عمل جدید ذرائع ابلاغ اور ڈیجیٹل پلیٹ فارم کے ذریعے زیادہ وسیع پیمانے پر ہو سکتا ہے۔ اس تناظر میں منٹو کی ہجوم کی نفسیات اور اجتماعی نفرت کے بارے میں بصیرت ایک نئے معنی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ ان کا فکشن ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ انسان کو مسلسل کسی دوسرے گروہ کے خلاف خوف اور نفرت میں مبتلا رکھا جائے تو اجتماعی اخلاقیات کس طرح کمزور ہو سکتی ہیں۔ عصری معنویت کا ایک اہم پہلو جبری ہجرت بھی ہے۔ آج بھی دنیا کے مختلف خطوں میں جنگ، سیاسی تنازع، مذہبی کشمکش اور معاشی بحران کے باعث لوگ اپنے گھروں سے نقل مکانی پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان افراد کے لیے ہجرت صرف جغرافیائی منتقلی نہیں بلکہ شناخت، گھر، یادداشت اور سماجی تعلقات کا بحران بھی ہے۔ منٹو کی مہاجری افسانہ نگاری اس انسانی تجربے کو سمجھنے کے لیے آج بھی اہم ہے، کیونکہ ان کے کردار ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ مہاجر محض اعداد و شمار یا سیاسی مسئلہ نہیں بلکہ یادوں، رشتوں اور جذبات رکھنے والا انسان ہے۔ عصرِ حاضر میں مذہبی اور سیاسی تقسیم کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے تناظر میں بھی منٹو کا فکری موقف قابلِ توجہ ہے۔ ان کے ہاں مذہب کو انسان دشمنی کے جواز کے طور پر استعمال کرنے پر شدید سوال اٹھایا جاتا ہے۔ وہ اس ذہنیت کو قبول نہیں کرتے جس میں مذہبی وابستگی انسان کو دوسرے انسان سے نفرت کا اخلاقی حق دے دیتی ہے۔ آج کے معاشرے میں بھی یہ سوال بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ مذہبی یا نظریاتی اختلاف کے باوجود کیا انسانی وقار اور جان کی حرمت محفوظ رہ سکتی ہے؟ منٹو کا فکشن اس سوال کا جواب انسانی سطح پر تلاش کرتا ہے۔ منٹو کی عصری معنویت کا تعلق آزادیِ اظہار سے بھی ہے۔ وہ ایسے موضوعات پر لکھتے ہیں جنہیں معاشرہ اکثر دبانے یا چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے ہاں ادیب کا کام خوش کن تصورات کی حفاظت کرنا نہیں بلکہ حقیقت کے ان پہلوؤں کو سامنے لانا بھی ہے جنہیں دیکھنا معاشرے کے لیے تکلیف دہ ہو۔ آج بھی ادب، صحافت اور فنونِ لطیفہ میں یہ سوال موجود ہے کہ کیا

فن کو معاشرتی مصلحت کے نام پر حقیقت چھپانی چاہیے؟ منٹو کی زندگی اور تخلیقات اس بحث میں ایک مضبوط مثال فراہم کرتی ہیں کہ فن کی آزادی معاشرتی خود احتسابی کے لیے کیوں ضروری ہے۔

البتہ منٹو کی عصری معنویت کو صرف اس بنیاد پر ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے موضوعات آج بھی موجود ہیں۔ ان کی اہمیت اس سے آگے ہے۔ ان کے افسانے ہمیں موجودہ مسائل کو دیکھنے کا ایک فکری طریقہ فراہم کرتے ہیں۔ وہ ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ کسی بحران کو صرف سیاسی نعرے، مذہبی شناخت یا قومی مفاد کے ذریعے نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اس کے انسانی اثرات کو بھی مرکز میں رکھنا چاہیے۔ یہی طرزِ فکر منٹو کو محض تقسیم کے افسانہ نگار کے بجائے انسانی معاشرے کے نقاد کے طور پر اہم بناتا ہے۔

منٹو کے فکری موقف کا خلاصہ یہ نہیں کہ وہ صرف معاشرے کی برائیاں دکھاتے ہیں۔ ان کی اصل اہمیت یہ ہے کہ وہ انسان کو اس کی پوری پیچیدگی کے ساتھ دیکھتے ہیں اور معاشرے سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے اخلاقی دعووں کو عملی رویوں سے ثابت کرے۔ وہ نفرت کے مقابلے میں انسانیت، منافقت کے مقابلے میں حقیقت، اجتماعی تعصب کے مقابلے میں فرد کی شناخت اور اخلاقی دکھاوے کے مقابلے میں حقیقی انسانی وقار کو اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ منٹو کی افسانہ نگاری کی عصری معنویت ان کے موضوعات کے محض موجودہ دور میں دوبارہ ظاہر ہونے سے نہیں بلکہ ان کے فکری سوالات کی پائیداری سے پیدا ہوتی ہے۔ تقسیمِ ہند کا واقعہ تاریخی طور پر گزر چکا ہے، لیکن شناخت کا بحران، مذہبی تعصب، جبری ہجرت، اجتماعی نفرت، عورت کے خلاف تشدد، انسانی بے حسی اور آزادیِ اظہار کے مسائل مختلف صورتوں میں آج بھی موجود ہیں۔ منٹو کا فکشن ان مسائل کو سمجھنے کے لیے ایک ایسا انسانی اور تنقیدی زاویہ فراہم کرتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ غیر متعلق نہیں ہوتا۔

منٹو کا فکری موقف بنیادی طور پر انسان کی حرمت، فرد کی آزادی، حقیقت پسندی اور سماجی منافقت کے خلاف مزاحمت پر قائم ہے۔ تقسیمِ ہند کے فسادات نے ان کے سامنے انسانی تہذیب کے ایسے پہلو کھول دیے جنھیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ انھوں نے ان تجربات کو نہ قومی جذبات کی پردہ پوشی میں چھپایا اور نہ کسی ایک گروہ کے خلاف تعصب میں تبدیل کیا۔ انھوں نے انسان کو مرکز بنایا اور اسی بنیاد پر اپنے عہد کے سماجی و اخلاقی بحران کا جائزہ لیا۔ یہی انسان مرکز فکری رویہ ان کی افسانہ نگاری کو آج بھی زندہ، سوال انگیز اور معنویت سے بھرپور بناتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص:۲

۲۔ سعادت حسن منٹو ، پھندے ، مکتبہ جدید، دہلی، ۱۹۵۴ء ، ص : ۲۰

۳۔ منٹو کے منتخب افسانے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۲ء، ص:۱۷۴-۱۷۵

۴۔ سعادت حسن منٹو، ٹھنڈا گوشت، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۰ء، ص:۹۵

۵۔ سعادت حسن منٹو، پھندے، ص:۹

۶۔ منٹو کے منتخب افسانے، ص:۳۶۶

۷۔ سعادت حسن منٹو، سیاہ حاشیے، اتحاد پریس، لاہور، ۱۹۵۲ء، ص:51

۸۔ سعادت حسن منٹو، نمرود کی خدائی ساقی بک ڈپو، دہلی، ۱۹۸۲ء ص:۱۰۸

۹۔ سعادت حسن منٹو ، سڑک کے کنارے، نیو تاج آفس، دہلی، ۱۹۵۳ء، ص:۱۱۹

۱۰۔ سعادت حسن منٹو، یزید، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۱ء، ص:۲۳-۲۲

۱۱۔ سعادت حسن منٹو، موذیل، خیابان پبلی کیشنز، بمبئی، ۱۹۷۹ء، ص:۴۳-۴۲

۱۲۔ سعادت حسن منٹو ، چغد، ساقی بک ڈپو ، دہلی ، ۱۹۸۱ء، ص : ۸۰

۱۳۔ سعادت حسن منٹو ، منٹو کے فحش افسانے، نیو تاج آفس، دہلی، ۱۹۵۳ء ص:۷

Reference:

1. Khalid Ashraf, Doctor, Fasane Manto Ke Aur Phir Bayan Apna, Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Delhi, 2006, p: 2
2. Saadat Hasan Manto, Phande, Maktaba-e-Jadeed, Delhi, 1954, p: 20
3. Manto Ke Muntakhab Afsane, Educational Book House, Aligarh, 2002, pp: 174-175
4. Saadat Hasan Manto, Thanda Gosht, Maktaba-e-Jadeed, Lahore, 1950, p: 95
5. Saadat Hasan Manto, Phande, p: 9
6. Manto Ke Muntakhab Afsane, p: 366
7. Saadat Hasan Manto, Siyah Hashiye, Ittehad Press, Lahore, 1952, p: 51
8. Saadat Hasan Manto, Namrood Ki Khudai, Saqi Book Depot, Delhi, 1982, p: 108
9. Saadat Hasan Manto, Sadak Ke Kinare, New Taj Office, Delhi, 1953, p: 119

10. Saadat Hasan Manto, Yazid, Maktaba-e-Jadeed, Lahore, 1951, pp: 22-23
11. Saadat Hasan Manto, Mautsel (Mozil), Khiyaban Publications, Bombay, 1979, pp: 42-43
12. Saadat Hasan Manto, Chughd, Saqi Book Depot, Delhi, 1981, p: 80
13. Saadat Hasan Manto, Manto Ke Fuhsh Afsane, New Taj Office, Delhi, 1953, p: 7